© rasailojaraid.com

محمد سرور

سوڈان میں عرب دانشوروں کا اجتماع

سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں ۱۵ سے ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء تک عرب دانش وروں کا ایک اجتماع ہوا تھا، جس میں سوڈان، جمہوریہ متحدہ عرب (مصر)، لیبیا، الجزائر، اُردن، لبنان، جنوبی یمن، مراکش، عراق، سعودی عرب، شمالی یمن، شام اور فلسطین کی فدائی تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اِس سے پہلے اسی قسم کا اجتماع ۲۲ سے ۲۸ مئی ۱۹۶۷ء تک الجزائر میں ہوا تھا۔ دمشق سے شائع ہونے والے ماہنامہ "المعرفۃ" نے خرطوم کے اس اجتماع میں جو مقالات پڑھے گئے اور اُن پر جو بحثیں ہوئیں وہ اپنے جون و جولائی ۱۹۷۰ء کے شماروں میں چھاپ دی ہیں۔ ہم[۱] "المعرفۃ" سے اس اجتماع کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

دانشوروں کے اس اجتماع کے لئے موضوعِ زیرِ بحث تھا، عرب انقلاب اور اس کے فکری و تنظیمی مسائل۔ اجتماع کا افتتاح سوڈان کے مجلسِ قیادتِ انقلاب کے صدر اور وزیرِ اعظم اللواء (جنرل) جعفر محمد نمیری نے کیا۔ اُنھوں نے ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء کے انقلابِ سوڈان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک نئے مرحلے کے آغاز کا اعلان ہے۔ اِس میں قوم کو خود اپنے اوپر اعتماد کرنا بحال کیا گیا ہے۔ یہ انقلاب ثقافتی تہذیبی اور روحانی بیداری کے لئے سرگرمِ کار ہوگا اور اسے اِس بات پر گہرا یقین ہے کہ سوڈان کا عربی تہذیب کے منبعوں سے تعلق ہے۔ اور وہ انقلابِ عرب کا ایک حقیقی رکن ہے۔ سوڈان کے تہذیبی اصولوں کے مرجع اُمتِ عربیہ ہے، اور اس کے ذریعہ وہ برِّ اعظم افریقہ کے اندر تک پھیلی ہے۔ ۲۵ مئی کے انقلاب نے فکری قوتوں کے بندھن توڑ دیئے اور علم کے لئے وسیع میدانِ عمل کھول دیئے۔

حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے جنرل نمیری نے کہا کہ ہمارے اس انقلاب کا مقصد پس ماندگی، جمود اور دوسروں پر سہارا لینے سے اپنی قومی معیشت کو آزاد کرانا ہے۔ ہمارے تہذیبی و روحانی ورثے کا منبع اُمتِ عربیہ

۱۔ دمشق کا ماہنامہ "المعرفۃ" کافی عرصے سے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور میں آرہا ہے۔ یہ مضمون اسی کے دو شماروں سے لیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا تجربہ ہے، اور اُمت عربیہ کی عربیت اور اس کی اسلامیت ایک ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دعوت ہے نیکی، عدل اور مساوات کی۔

جنرل نمیری کے بعد سوڈان کے وزیر شباب، ریاضت اور اُمورِ اجتماعی ڈاکٹر منصور خالد نے تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ عربی سیاست کو آج جو سنگین چیلنج درپیش ہے وہ اس کا مقابلہ کرنے میں کمزور ہے۔ اور اس کی کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ عربی سیاسی فکر پیچھے رہ گیا ہے۔ عربی سیاسی عمل یعنی عرب جمہور میں آگے بڑھ کر کچھ کرنے کا زبردست جذبہ و ولولہ ہے۔ اور عربی سیاسی فکر اس کا ساتھ نہیں دے رہا۔ اور باوجود اس کے کہ فکر و عمل میں اور نظریہ و فعل میں ربط ہونا چاہیئے، وطن عربی میں یہ نہیں ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر منصور خالد نے عربی سیاسی فکر کی پس ماندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ سیاسی فکر بلکہ ہر فکر کے لئے اگر وہ مفید اور نفع مند ہونا چاہتا ہے، ضروری ہے کہ اس کے مرکزی اساس ہوں۔ ان میں سے ایک اصلیت اور دوسرا اس کی فعالیت ہے۔ اصلیت سے مراد ہے اس فکر کی سماج میں جس میں وہ پروان چڑھنا چاہتا ہے، فکری و روحانی جڑیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ جدید سماج خودرو پودوں کی طرح نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ تاریخی پھیلاؤ ہوتے ہیں اُن تجربات و معاملات کا جن سے اُس سماج کے افراد کو سابقہ پڑتا ہے۔ آج کسی سماج کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اپنی اس تاریخی اصلیت کا انکار کر سکے۔ اور اپنی جڑوں سے سیراب نہ ہو کر اپنے آپ کو ترقی دے سکے۔ دوسرا مرکزی اساس یعنی فکر کی فعالیت سے مراد اپنے وجودِ ذاتی کا احساس اور اُس کی مقدرت اور اس کے مادی و معنوی امکانات کا شعور ہے۔

ڈاکٹر منصور کے نزدیک آج عربی فکر سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ عربی وطن میں عربی و اسلامی تحریکاتِ بیداری کی فکری جڑوں کا مطالعہ کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ مثال کے طور پر جزائر نے اپنی جدوجہد میں "جہاد" اور آزادیٔ وطن کے دو نکروں میں باہم ربط پیدا کر کے فائدہ اُٹھایا۔ دین کو ایک مقدس دعوت سمجھنے سے اس جدوجہد میں وسعت و گہرائی پیدا ہوئی اور اس طرح یہ ممکن ہوا کہ اس دینی عقیدہ نے جزائری عوام کے دلوں میں اپنی سرزمین کی آزادی کو ایک تاریخی ورثے کی شکل دے دی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو سکا کہ اس جدوجہد کی اساس ایک مضبوط اسلامی فکر تھا۔ جس کی ابتدا، امیر عبدالقادر سے ہوئی اور عبر بن بادیس سے منتقل ہوتا ہوا یہ فکر جزائری علمائے دین کی جماعت تک پہنچا۔ اگر مجھے مبالغہ کا ڈر نہ ہوتا تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اس اسلامی فکر[۲] کو ابن خلدون تک لے جاتا۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی کا تجربہ اس امر کی ایک اور واضح مثال ہے۔ اس تجربے میں اسلام کے عقیدۂ جہاد کو وطن کی آزادی کے لئے جدوجہد کی شکل دی گئی۔

آخر میں ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ آج سے پہلے کبھی فکرِ عربی سے اس کا مطالبہ نہیں کیا گیا کہ وہ ایک طرف اپنی فکری و روحانی میراث کو اپنی اساس بنائے۔ دوسری طرف وہ جس معاشی حقیقتِ واقعی سے اس وقت دوچار ہے، اس سے مربوط ہو۔ علمی منہج فکر کو اختیار کرے۔ ان تجربات انسانیت سے فائدہ اٹھائے، جن کا دروازہ اب تک ہم پر بند رہا۔ یہ جان لے کہ انسانی سماجوں کو قوانین و ضوابط کے انقلابات تبدیل نہیں کیا کرتے۔ بلکہ فکری جدوجہد اور سوچے سمجھے عمل سے ان میں تبدیلیاں آتی ہیں اور اس کو یہ ذہن نشین ہو کہ انقلاب نام وقتی طور پر جوش میں آنے کا نہیں جو کہ بائیں بازو کے بچپنے کا ایک مرض ہے۔

خرطوم کے اس اجتماع میں سب سے پہلا مسئلہ جو زیر بحث آیا، اس کا عنوان تھا۔ وہ "ارضیت" جس سے انقلاب عرب حرکت میں آیا۔ "ارض" کے معنی عربی میں زمین کے ہیں۔ "ارضیت" سے مراد وہ زمینی و مقامی حالات و کوائف ہیں، جو عرب قوم میں انقلاب کے محرک بنے۔ سب سے پہلا مقالہ مصر کے ابو سیف یوسف نے پڑھا۔ اس نے بتایا کہ اگر مسئلہ زیر بحث کو جذباتی نہیں بلکہ علمی لحاظ سے دیکھا جائے تو پھر کہنا پڑے گا کہ وہ حالات جن میں عرب انقلاب حرکت پذیر ہے، ان کے معروضی اور موضوعی پہلوؤں میں باہم مطابقت نہیں اور ہمارے اس انقلاب کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انقلابی اور ترقی پسند عرب قیادتوں میں آپس میں اتفاق نہیں۔ دوسرا مقرر ادیب العجیمی شام کا تھا۔ اس نے اپنے مقالے کا آغاز یوں کیا:

سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ عرب انقلاب بیک وقت عوامی، وحدوی (ساری عرب قوموں کو متحد کیا جائے) اور اشتراکی ہے نیز یہ کہ ہمارا انقلاب دنیا کے غیر جانبدار ملکوں کے انقلاب کا ایک حصہ ہے۔"

سوڈان کے بابکر کرار نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ عرب انقلاب پوری امتِ عربیہ کا انقلاب ہے اور یہ پورے وطن عربی میں ہے، یہ نتیجہ ہے سامراج اور صیہونیت کے خلاف عربوں کی جدوجہد کا اس انقلاب

۲؎ امیر عبدالقادر الجزائری ۱۶ سال تک فرانسیسی حملہ آوروں کے خلاف لڑتے رہے آخر انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے فرانسیسیوں نے انہیں دمشق جلاوطن کر دیا۔ متوفی ۱۸۸۳ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی چند خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) اُمّتِ عربیہ ایک وحدت ہے اور جب تک یہ منقسم رہے گی، زندگی اور ترقی سے ہم کنار نہیں ہو سکے گی۔

(۲) انقلابِ عرب کا مقصد وطنِ عربی سے سامراجی تسلط کی ہر شکل کو ختم کرنا ہے۔ اس کے لئے اُسے فلسطین سے اسرائیل کے وجود اور پس ماندگی اور تفرقہ کی ہر صورت کو ختم کرنا ہوگا۔ اور اس کی جگہ تمام بلادِ عربیہ میں ایک ترقی خواہ متحدہ سماج تعمیر کرنا پڑے گا۔

(۳) عربوں کے ہاں اسلام کی سیادت ہے۔ وطنِ عربی تین سماوی مذاہب کی مہد، یعنی پیدائش گاہ ہے۔ چنانچہ ہر انقلابی عمل کے لئے عربوں کے ہاں جو نظریہ ہوگا، وہ اسلام کی اساس پر ہوگا اور اسلام اساس ہے تمام دینوں کی وحدت اور پوری انسانیت کی وحدت کی۔ اسلام نے انسان کی آزادی اور عزت و شرف کے حق پر زور دیا ہے۔ اور تمام شریعتوں کے لئے عدل کو بنیاد قرار دیا ہے۔

(۴) اُمّتِ عربیہ انسانیت کے ایک ابدی پیغام کی حامل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عرب انقلاب امتِ عربیہ کی تاریخ سے پوری طرح مربوط ہو۔ اس انقلاب کو نسلی، علاقائی اور فرقہ وارانہ حد بندیوں سے بلند ہونا چاہیئے۔

آگے چل کر ایک جگہ "اسلام اور عربی تہذیب" کے عنوان کے تحت یہ سوڈانی دانشور کہتا ہے :۔

اُمّتِ عربیہ کی عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ اسلام ہے۔ اور وہ اس کا عقائدی اور تہذیبی اساس ہے۔ اس کی یہی تہذیبی خصوصیت تھی، جس نے عربی اُمّت کو پس ماندگی، جمود اور تفرقوں کے زمانوں میں پیہم صدمات و آفات کے دوران مع اس کے امتیازات کے محفوظ رکھا۔ اسی نے اُسے ایک ابدی پیغامِ انسانیت کا حامل بنایا، اور اس کی وجہ سے اُس نے انسانیت کو بہت کچھ دیا۔ اُمّتِ عربیہ کی یہی تہذیبی اساس تھی، جس نے اس کے لئے پستی و جمود کے زمانوں میں بھی ترقی و نمو کے وسائل بہم رکھے اور اس کی وجہ سے وطنِ عربی کی حدود حرکت پذیر اور وسعت پذیر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اُمّتِ عربیہ کی یہ تہذیبی اساس اس کی تعمیر کی ایک زندہ اساس ہے۔ نہ صرف تعمیر کی، بلکہ اس کی تاریخ، اس کے ورثے، اس کی روحانی قدروں، اس کی آزادی اور قومی تمناؤں کی بھی۔ اس لئے عرب انقلاب کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جدوجہد میں اس سے کسی صورت میں غفلت ممکن نہیں ۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ان تمام صدیوں اور زمانوں میں عرب عوام کے تمام انقلابوں اور جدوجہد میں اُن کے لئے سب سے بڑی روحانی محرک رہی ہے ، اور وہ آج بھی موجودہ عرب انقلاب کی شکل معین کرنے اور اُسے ایک خاص رُخ عطا کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر ہے ، اور جدید عربی انسان کی تعمیر میں اس کا سب سے بڑا ہاتھ ہے ۔

اس کے بعد بابکر کرار کہتا ہے :-

عرب انقلاب میں دین کیا فریضۂ منصبی سرانجام دے ، اُس کا تعین یوں کیا جا سکتا ہے ۔

(۱) دین عربی انسان کو کمالِ انسانیت کے اعلیٰ درجات تک لے جانے کا ایک منہج اور طریقہ ہے ۔

(۲) دین سماج کو وحدتِ انسانیت ، انسانی بھائی چارے ، کام کی عزت و احترام اور ہر شکل میں استحصال کی حرمت کے عقیدہ پر استوار کرتا ہے ۔

(۳) دین انسان کے لئے آزادی ، عزّ و شرف اور آسودگی کا حق تسلیم کرتا ہے ۔ اور اِس عقیدے پر سماج کی بنیاد رکھتا ہے ۔

(۴) دین تمام انسانوں کے ساتھ عدل کرنے اور ان کے درمیان صلح و آشتی قائم رکھنے کی اساس پر سماج تعمیر کرتا ہے ۔

عرب انقلاب کو اپنے اس مبنی بر حقیقت دلکش چوکھٹے کے اندر حرکت پذیر ہوا ہے ۔ سوڈان خاص افریقہ کا ایک حصہ ہے ، اور وہاں عربیت اور افریقیت دونوں ملتی ہیں ۔ بابکر کرار نے اِس ضمن میں کہا :- ہمارے ملک کا ایک مسئلہ اور ہے اور وہ ہمارے لئے خاص ہے ، اور وہ یہ ہے :-

عرب انقلاب اور افریقی انقلاب کا آپس میں کیا تعلق ہے ؟ اس سوال کے جواب کے لئے مندرجہ ذیل بنیادی حقائق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ۔

(۱) عرب افریقہ کی سب سے بڑی قوم ہیں ۔

(۲) افریقہ میں اسلام کو ماننے والے دوسرے ادیان کے ماننے والوں سے زیادہ ہیں ۔

(۳) عربی زبان افریقہ میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی ہے ۔

(۴) افریقہ کی اکثر زبانوں میں عربی زبان کا اختلاط ہوا ہے ۔

(۵) تمام غیر عرب قوموں کے مقابلے میں جغرافیائی لحاظ سے افریقی قوموں سے سب سے زیادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قریب اُمتِ عربیہ ہے۔

(۶) افریقہ میں مغربی تہذیب کا داخلہ اُمتِ عربیہ کے ذریعہ ہوا۔

غرض ان تاریخی، تہذیبی اور جغرافیائی حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ افریقہ میں عربی وجود کی جڑیں کافی گہری اور وسیع ہیں اور یہ کہ عرب انقلاب افریقی انقلاب کا ایک جزوِ لاینجزی ہے

خرطوم کے اس اجتماع کا دوسرا موضوعِ زیر بحث تھا۔ عرب انقلاب کے فکری اور روحانی مرکزی نقاط۔ اس بحث کا آغاز لبنان کے موجودہ وزیر داخلہ اور وہاں کی "تقدمی اشتراکی" پارٹی کے لیڈر کمال جنبلاط نے کیا، موصوف گو ایک سیاسی لیڈر ہیں، لیکن اُن کا شمار عرب دانشوروں میں ہوتا ہے۔ وہ دروزی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو اسماعیلی شیعی مذہب کی ایک شاخ ہے

سب سے پہلے لبنانی دانشور نے عرب انقلاب کے تین مراحل کا ذکر کیا۔ اُس کے نزدیک موجودہ مرحلہ جو اس کا تیسرا مرحلہ ہے۔ اقتصادی، اجتماعی اور ثقافتی ڈیموکریسی یعنی اشتراکیت ہے۔ اور اسے ہم آج عالمِ عرب میں بروئے کار آتا اور ترقی کرتا دیکھ رہے ہیں۔ اس تمہید کے بعد موصوف عرب انقلاب کے مرکزی نقاط یوں بیان کرتے ہیں :-

(۱) عربی ورثہ اور عربی تہذیب۔ باوجود اس کے کہ عربوں کو قبل از اسلام کے دورِ جاہلیت سے نکلے عرصہ دراز ہو گیا، لیکن اب تک ہم میں جاہلی ذہنیت اور اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ یہ جو ہم میں قبیلہ دارانہ انفرادیت اور مصلحتِ عامہ کے مقابلے میں شخصی مصلحت اندیشی پائی جاتی ہے۔ تو یہ اُسی وراثتِ جاہلیت کا اثر ہے۔ عرب قومیت کی اشتراکی منزل میں بھی تاریخی عربی انسان کی یہ خاصیت باقی رہے گی۔

(۲) اسلامی ورثہ اور اسلامی معتقدات۔ عرب انقلاب کو حرکت میں لانے میں اس کا بھی حصہ رہا ہے خصوصاً مراکش، الجزائر اور لیبیا میں آزادی کی جدوجہد میں دین اور اسلامی ورثے نے بڑا کام کیا۔ لیکن یہ جو دینی عصبیت تھی، اسے مذہبی تعصب نہیں سمجھنا چاہیئے۔

جنبلاط کہتے ہیں :- ہمیں کسی حال میں بھی یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بیک وقت عربیت کو زندہ کرنے والے اور اُس کے اوّلین قائد بھی تھے اور نبی بھی۔ آپ کی یہ دونوں صفتیں اور پیغامات آپس میں اس طرح مدغم تھے کہ اُن کے درمیان خطِ فصل کھینچنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ قرآن، حدیث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دورِ جاہلی کا ادب، صحابہ اور بعد میں آنے والے اربابِ علم و عرفان کے اقوال یہ سب کے سب لغوی اور معنوی عربی ورثے کا بنیادی منبع و مصدر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس اصل کا یونانی عقل، ایرانی تہذیبی ورثے یہاں تک کہ قدیم مصریت سے تصادم ہوا۔ اور ایک نے دوسرے کا اثر لیا۔ اس کے علاوہ اس اصل کو عیسائی، یہودی، صابی اور دوسرے مذاہب سے سابقہ پڑا اور اس طرح باوجود بعد کی صدیوں کے جمود کے ایک روشن اور کامل انسانی تہذیب پروان چڑھی۔

اس سلسلے میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ بھی ہمیشہ یاد رکھیں کہ اس تہذیبی ورثے اور اسلامی معتقدات میں انبیا اور پہلے دینوں کا اعتراف کرنے کی وسعت موجود تھی۔ اس سے دوسروں کو کچھ دینے، اُن سے کچھ لینے، عمل اور ردِعمل، مل جل کر رہنے اور اجتماعی ہم آہنگی کا راستہ کھل گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، صحابہ اوّلین، خلفاء، اربابِ ادب و صوفیہ نے اپنی زندگیوں میں اسلام کا جو نمونہ پیش کیا، اس کا عربی شعور و خیال کی تشکیل اور عربی ذہنیت کو مخصوص ڈھرے میں ڈالنے پر بڑا اثر پڑا۔ اسے اسلامی معتقدات اور اسلامی ورثے کی تاثیر کا نتیجہ سمجھیے کہ آج بھی عربی دنیا میں کوئی ایسی حکومت نہیں، جو سیکولر ہونے کی مدعی ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر عرب حکومت خواہ وہ عراق و شام کی ہو یا مصر کی، یہاں تک کہ جنوبی یمن کی عوامی جمہوریہ بھی اپنے دستور کی سب سے پہلی شق میں اس امر کا اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ "دین الدولۃ الاسلام" (حکومت کا دین اسلام ہے)۔

کمال جنبلاط کے نزدیک عرب انقلاب کا تیسرا فکری مرکزی نقطہ مغربی سیاست کے ڈیموکریٹک افکار اور چوتھا نقطہ اشتراکیت کے اصول مبادی اور مارکسیت کی تفسیر ہے۔

ایک اور لبنانی دانشور کریم مروہ نے گزشتہ دو صدیوں میں عرب ملکوں میں جو تغیرات ہوئے اور وہاں جو قومی آزادی کی تحریکیں اُٹھیں اُن کا تجزیہ کرنے کے بعد آخر میں یہ کہا اوپر جو کچھ بتایا گیا، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر عرب انقلاب نے اپنے آخری مرحلے میں اشتراکیت کو اپنا لیا ہے تو یقیناً اس سے اگلا مرحلہ سائنسی اشتراکیت یعنی مارکسیت لینینزم کا ہے۔

مقالات پڑھنے کے بعد موضوعِ زیرِ بحث پر تبادلۂ خیالات ہوا مصر کے جمال عقیفی نے کہا:-

دیکھنا یہ چاہیئے کہ اشتراکیت اور عربی اور اسلام کی روحانی قدروں میں بحیثیت عمومی کیا تعلق ہے؟ نیز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب سائنسی اشتراکیت یہ تسلیم کرتی ہے کہ ہر ملک کا اشتراکیت تک پہنچنے کا اپنا خاص طریقہ ہے تو خود وطنِ عربی میں بھی ایک عربی ملک کا دوسرے عربی ملک سے اشتراکیت کا الگ الگ طریقہ ہوسکتا ہے۔

موصوف نے اس امر پر بھی زور دیا کہ سائنسی اشتراکیت کے فکر کو اپنانے کے لئے ضرورت ہے اس کردار کو سمجھنے کی جو عربی سماج میں دین پورا کرسکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس حقیقت کو پیشِ نظر نہ رکھا گیا تو عوام اشتراکیت کی تحریک سے بے تعلق رہیں گے۔ مزید برآں اگر ہم اشتراکی فکر کو مستحکم کرنے کے لیے دین پر اعتماد کرتے ہیں تو ہمیں دینی اداروں اور رجعت پسندی کو الگ الگ کرکے دیکھنا ہوگا۔

اجتماع میں تیسرا موضوع جو زیرِ بحث آیا، وہ تھا عرب انقلاب کا اقتصادی ڈھانچہ۔ اس بحث کا آغاز مصر کے اسماعیل صبری عبداللہ نے کیا۔ اس نے کہا کہ عہدِ حاضر میں انقلابی جدوجہد کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے اقتصادی امور کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب تک احتیاج اور استحصال سے آزادی نہ ملے، انسان پر تہذیب و ثقافت اور فکر کے دروازے بند رہتے ہیں۔ موصوف نے کہا کہ اس بات پر آپ سب کا اتفاق ہوگا کہ عرب انقلاب اپنے جوہرِ اصلی میں سامراجی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک اور سماجی ترقی اور وحدتِ قومیتِ عرب کی جدوجہد ہے۔ ان تین مقاصد کا مرکزی نقطہ اقتصادی ہے۔ اور اسی پر آج عربوں کی تہذیبی عمارت کی تعمیر ہوسکے گی۔

اسماعیل صبری نے اپنے مقالے کے شروع ہی میں عرب ممالک اور اسرائیل کی صلاحیتِ کار کا موازنہ کیا۔ اور عربوں کی شکست کو اُن کی پس ماندگی کا نتیجہ بتایا۔ اُس نے کہا:۔

یہاں اس اجتماع میں ہم میں سے کسی کو اس بات سے اختلاف نہیں ہوگا کہ انسانیت کی صفوں میں اُمتِ عربیہ کو باعزت مقام کبھی اپنی تاریخ کے گیت گا کر، انسانی تہذیب میں ماضی میں اپنے حصے کا ذکر کرکے اور اپنی قومی صفات کو بار بار بیان کرکے حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم انسانیت کے قافلے سے کئی صدیاں پیچھے ہیں۔ اور ہمارا فرض ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکے، ہم اپنی اس پس ماندگی کو دور کریں۔ دوسرے الفاظ میں ہم مجموعی طور پر اپنی قوتِ نمود ترقی کو بڑھائیں۔ یعنی عربی زندگی کے تمام مظاہر کو ہر جہت سے ترقی دیں، اقتصادی، اجتماعی، سیاسی اور ثقافتی سب مظاہر کو۔

اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہمارے اور صیہونی سامراجی دشمن کے درمیان تصادم خالصتاً فوجی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوعیت کا نہیں ہے، بلکہ یہ تصادم اپنے وسیع تر معنوں میں تہذیبی بھی ہے۔ اس اجتماع میں ہم لوگ جمع ہیں اور اپنے پہلے جرائم کے علاوہ اسرائیل ہمارے ممالک کے قیمتی حصوں پر قابض ہے۔ وہ اس پر جسے ہم یورپی تفوق کا لازمی طور پر ہونا، کہہ سکتے ہیں، فخر کر رہا ہے اور مزید غیر محدود توسیع ملک کے منصوبے بنانے میں لگا ہوا ہے تاکہ اس کا اقتصادی تسلط اور بڑھے۔ وہ پورے عرب خطے پر اپنا اقتصادی اثر و نفوذ پھیلانے کی خواہش رکھتا ہے۔ کیونکہ اُس کو یہ یقین ہے کہ ہم اپنی علمی سائنسی اور ٹیکنالوجی کی پسماندگی کی وجہ سے اپنے وسائل دولت سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھانے سے قاصر ہیں۔ عربی منڈیوں پر چھا جانے کی اسرائیل کو اس لئے اُمید ہے کہ عربی مصنوعات اس کی مصنوعات کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکیں گی۔

مصر کے اس دانشور نے یہ بھی اعتراف کیا کہ دنیا کے اکثر ثقافتی حلقوں میں اسرائیل کے لئے اچھا مقام اس لئے بھی ہے کہ عالمی و فکری زندگی کے تمام مظاہر میں اسرائیلی اہلِ علم و ادب و فن بڑے مشہور ہیں۔ اسی طرح بہت سے افریقی ملکوں میں اسرائیل کے اثر و نفوذ کی وجہ مال و جنس نہیں۔ جیسے بعض عربی اخبارات میں عام طور پر لکھا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سب چیز سے پہلے اسرائیل کی یہ قدرت و استطاعت ہے کہ وہ ان ملکوں کو عالمی سطح کے ایسے ماہرین دے سکتا ہے، جو اقدام، قابلیت اور پوری مستعدی سے کام کرنے میں ممتاز ہوتے ہیں۔ نیز ایسی ترقیاتی سکیمیں مہیا کر سکتا ہے، جو سائنسی بنیادوں پر بنائی گئی ہوتی ہیں۔

اس کے بعد صاحبِ موصوف نے متنبہ کیا کہ ہمیں اپنے آپ کو ان میں سے کسی چیز کے بارے میں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اِس زمانے میں خود فوجی تصادم بھی بہت حد تک سماجی ترقی و تقدم کے اسباب پر انحصار رکھتا ہے۔ چنانچہ جدید اسلحہ بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں اور اُن کے استعمال کے لئے ایک خاص علمی و تہذیبی سطح پر فائز ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح ان اسلحہ کا بنانا، ان کی حفاظت اور ان کی مرمت ٹھوس صنعتی استعداد کی متقاضی ہوتی ہے۔ ایسی جنگ جس میں مستقبل کا فیصلہ ہونا ہو، اس کے لئے پوری کی پوری قوم کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ اس میں پس ماندگی، جس کے مظاہر ایک دوسرے پر توکل کرنا، نظم و ضبط کا فقدان اور وقت کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ ہونا ہے، رکاوٹ بنتی ہے۔ یاد رہے، قوتِ نمود ترقی اپنے وسیع تر معنوں میں وہ بلند و مضبوط عمارت ہے، جو سامراج اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صیہونیت کے حملوں کے سامنے ٹھہر سکتی اور انھیں ناکام کر سکتی ہے۔

سعودی دانشور شیخ عبداللہ طریقی نے اس موضوع پر جو طویل مقالہ پڑھا، اس کا عنوان تھا۔ قومی ملکیت میں لئے ہوئے تیل کو بہنے دو۔ مقرر نے تیل کے ذخائر اس کی پیداوار اور کھپت کے متعلق دنیا بھر کے اعداد و شمار دینے کے بعد آخر میں کہا :- تیل کی کمپنیوں نے ہمارے ملکوں سے بے اندازہ دولت کمائی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے اور شاید یہ ہمارے لئے آخری موقع ہو کہ ہم ان کمپنیوں سے عربی تیل کی دولت واپس لیں، اور اُسے پوری عرب سرزمین کے وسائل کو ترقی دینے کے کام لائیں۔ آزاد مملکتوں کی حیثیت سے تیل کی کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینا ہمارا حق ہے۔ یہاں اتنا ذکر کر دینا کافی ہے کہ جب جنوبی امریکہ کے ملکوں پیرو، بولیویا اور میکسیکو نے اپنے ہاں کی تیل کی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا تو ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اُن کے اس اقدام پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ اُس نے ان ملکوں سے امریکی کمپنیوں کا لگا ہوئے سرمائے کا معاوضہ طلب کیا۔

اجتماع میں چوتھا موضوع جو زیر بحث آیا، وہ یہ تھا۔ قوائے انقلاب عرب۔

اس بحث کا آغاز لیبیا کے محمد المہدی نے کیا۔ اس نے کہا کہ اُمت عربیہ کو جن حوادث سے گزرنا پڑا ہے اور اس سلسلے میں اسے جو مصائب پیش آئے، اُن پر غور کرنے سے یہ تین حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں :-

(۱) اُمتِ عربیہ تجدد اور فعالیت کی بہت کافی مقدار کی مالک ہے، جو اُسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ بحرانوں اور شکستوں میں سے گزر سکے اور انہیں ایک مضبوط جڑیں رکھنے والی قوم کی طرح کامیابیوں میں بدل دے۔

(۲) عرب انقلاب کا اپنے حقیقی مواد سے جو عرب عوام کی شکل میں متمثل ہے، عضویاتی ارتباط ہے اور اس کی حیثیت عوامی جدوجہد کے قائد کی ہے جو رجعت پسند قوتوں کو شکست دینے پر قادر ہے۔

(۳) مسلح انقلابی دستوں کا اس حیثیت سے آگے آنا کہ اُن کا تعلق عوام اور طبقات سے ہے اور عوام کی قیادت کے سلسلے میں ان کا انقلابی قوتوں کا سربراہ بننا اور اس طرح انقلابی دھماکے کا ہونا۔ یہاں عوامی قوتوں کا انقلاب میں جو دور تھا، وہ نظروں سے اوجھل نہ رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقالہ نگار نے عربوں کی جدوجہد آزادی کے مختلف مراحل بیان کرنے کے بعد آخر میں یہ سوال پوچھا کہ اس جدوجہد کے دوران قومی سیاسی پارٹیوں کا کیا کردار رہا۔ نیز وہ پارٹیاں جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتی ہیں، جب وطن عربی کے مختلف میدانوں میں انقلابی دھماکے ہوئے تو اس وقت وہ کہاں کھڑی تھیں پھر یہ کہ یہ انقلابی قوتیں انقلابی دھماکہ برپا کرنے میں کیوں قاصر رہیں۔ میدانِ کارزار سے وہ کیوں غائب رہیں موصوف نے اِن سوالوں کا جواب دیتے ہوئے تسلیم کیا کہ ترقی پسند عرب پارٹیاں عوام کو طبقاتی بنیادوں پر منظم کرنے میں بالکل ناکام رہیں، بلکہ بعض اوقات وہ عوام سے جُدا ہو گئیں۔ بقول اُس کے ضرورت اِس کی ہے۔ کہ سب سے پہلے عوام کو انقلاب کے اصل مواد سمجھا جائے اور مسلح انقلابی قوتوں اور عوام میں پوری ہم آہنگی ہو۔ دوسرے عربی جدوجہد کو انسانی جدوجہد کا ایک جزو سمجھا جائے کہ دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں اور تیسرے یہ کہ ہم اپنے قومی حالات اور اپنے عربی سماج کی خصوصیات کا لحاظ رکھتے ہوئے اشتراکیت کو اپنائیں۔

اِس موضوع پر متعدد دانشوروں نے اپنے مقالے پڑھے۔ شام کے فوزی الکیالی نے اپنے مقالے میں بتایا کہ چونکہ انقلاب کا مقصد اقتدار پر قبضہ کر کے قائم شدہ سماجی رشتوں کو توڑ کر انہیں نئے سرے سے بدلنا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر وہ طبقہ جو قائم شدہ سماجی رشتوں کو اپنی ترقی میں رکاوٹ اور اپنے مقاصد کی تکمیل میں حارج سمجھتا ہے اور نئے سماجی رشتوں میں اُسے اپنی بہبود نظر آتی ہے۔ وہ انقلابی قوتوں میں ایک قوت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ پھر طبقات کا موقف سماج میں چونکہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے ہمیں انقلابی جدوجہد کے ہر مرحلے میں ہر طبقے کے کردار کو متعین کرنا پڑتا ہے۔

یہ قاعدہ بیان کرنے کے بعد شامی دانشور نے پہلی جنگ عظیم کے بعد سے لے کر جون ۱۹۶۷ء کی شکست تک انقلابی جدوجہد کے سلسلے میں ہر طبقے کا جو رول رہا ہے، اس کا تجزیہ کر کے آخر میں کہا۔ ہمارا انقلاب اُس وقت جس بحران سے دوچار ہے، اس کی وجہ عربی سماج میں پس ماندگی کے وہ عوامل ہیں، جن کا تعلق علاقائی، طبقاتی، سماجی، دینی اور فرقی تفرقوں سے ہے جو ہمیں ماضی سے وراثت میں ملے ہیں۔

مصر کے احمد بہاؤ الدین نے عرب انقلاب کی مشکلات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ ایک تو تمام عربی ممالک میں انقلاب کی ایک سی نوعیت نہیں۔ دوسرے اُمتِ عربیہ کو ایک ساتھ سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلابات کرنا پڑ رہے ہیں۔ تیسرے ہر عربی ملک کی اپنی الگ الگ سیاسی صورت حال ہے اور آخر میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کہ یہ ملک ایک لحاظ سے الگ الگ بھی ہیں اور ایک لحاظ سے ایک دوسرے سے متصل بھی ۔ یہی وجوہات ہیں کہ یہاں جو انقلابات ہوئے، اُن میں فوجی افسروں نے قیادت کی ۔ احمد بہاؤالدین نے کہا کہ یہ عرب انقلاب کی ایک بڑی کمزوری ہے ۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ انقلابات عوامی مفاد کے لئے بروئے کار آئے لیکن عوامی مفاد کے انقلاب عوام ہی کے ہاتھوں ہوں تو اچھا رہتا ہے ۔

دوسرے موضوع جن پر مقالات پڑھے گئے، یہ تھے :۔ عرب انقلاب کے لئے تنظیمی بیداری فوج اور عرب انقلاب میں اُس کا مقام ، اور آخری موضوع یہ تھا :۔ قضیہ فلسطین بحیثیت ایک عرب انقلاب کے محور کے ۔

خرطوم کے اس اجتماع میں جن دانشوروں نے مقالات پڑھے یا مقالات پر بحثوں میں حصہ لیا ۔ اُن میں سے تمام کے تمام کا اس بات پر اتفاق تھا کہ اُمتِ عربیہ کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے :۔ آزادی ، وحدت اور اشتراکیت ۔ اب یہ تینوں الفاظ ایسے ہیں ، جن کی بے شمار تعبیرات ہو سکتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان تعبیرات کی بناء پر عرب ملکوں کی سیاسی پارٹیوں میں آپس میں کافی اختلافات ہیں ۔ جہاں تک عرب دانشوروں کا تعلق ہے ۔ عراق ، لبنان اور شام کے اکثر دانشور اپنے بائیں نقطہ نظر میں کافی انتہا پسند ہیں ۔ لیکن لیبیا ، الجزائر یہاں تک کہ سوڈان اور مصر میں یہ انتہا پسندی نسبتاً کم ہے اور ان ملکوں کی حکمران پارٹیوں کی اشتراکیت اسلامی قدروں کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش کرتی ہے

دُنیائے عرب کو سامراج اور صیہونیت کا خطرہ تو درپیش ہے ہی، لیکن اتنا ہی اہم اُسے آج ایک فکری چیلنج کا سامنا کرنا ہی پڑ رہا ہے ۔ ایک زمانے میں اُمتِ عربیہ واسلامیہ کو یونانی عقل اور ایرانی تہذیب کا چیلنج قبول کرنا پڑا تھا ، اور آج اس کو مارکسی یعنی عقل اور یورپی تہذیب سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے خرطوم کے اس اجتماع میں بعض مقالات نگاروں سے اس بات پر زور دیا کہ انتہائی بایاں نقطہ نظر انقلابی قوتوں کو عوام سے الگ تھلگ کر دے گا ۔ اور یہ کہ جیسا کہ سوڈان کے بابکر کرار نے کہا :۔

" عربی اسلامی ورثے میں بھی انقلابی عناصر موجود ہیں اور اسلام کا انقلابی پہلو عربی ورثے کو پہچاننے میں مدد دے گا ۔ اور انقلاب عرب کو اس سے استفادہ کرنا چاہیئے "

© rasailojaraid.com